Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue

Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

اردو فکشن کاارتقاء: حقیقت نگاری اور سماجی تناظرمیں

Urdu Fiction ka Irtiqa: Haqiqat Nigari aur Samaji Tanazur Mein

غلام شبیر
پی ایچ ڈی اسکالر ،شعبہ اردو، نیشنل
کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن
اینڈ اکنامکس ، ملتان

نیلم امبرین
پی ایچ ڈی اسکالر ،شعبہ اردو، نیشنل
کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن
اینڈ اکنامکس ، ملتان

ڈاکٹر اسلم عزیز دورانی
پروفیسر،شعبہ اردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن
اینڈ اکنامکس ، ملتان

ABSTRACT

This research article delves into the evolutionary trajectory of Urdu fiction, tracing its origins from traditional storytelling to modern fictional forms enriched with social realism. It discusses how fiction emerged as a literary response to human curiosity, emotional introspection, and socio-cultural circumstances. The paper explores the post-1857 shift in narrative consciousness, highlighting the contributions of Deputy Nazir Ahmad, Ratan Nath Sarshar, and Mirza Hadi Ruswa, who brought realism and reformist ideology into Urdu fiction. Further, it examines the significant role played by Premchand in introducing short fiction grounded in rural life, economic injustice, and class disparity. The article also investigates the literary dichotomy of realism and romanticism, as reflected in the works of early 20th-century writers like Niaz Fatehpuri and Sajad Haidar Yildirim. Lastly, it analyzes how Progressive Writers like Saadat Hasan Manto, Ismat Chughtai, Rajinder Singh Bedi, and others infused Urdu fiction with internal realism, psychological depth, and social critique—transforming fiction into a powerful mirror of evolving human and societal dynamics.

ادبی تخلیقات کی تفہیم کے سلسلے میں دنیا کے مختلف دانشوروں نے ہر دور میں اپنی سو چ کو الفا ظ کا رو پ دیا ۔اگر فکری سطح پر غور کیا جا ئے تب یہ حقیقت کھل کر سا منے آ تی ہے کہ سبھی نظریات کسی نہ کسی پہلو سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ادب کی تمام اصناف چاہے وہ نثر ہو یا نظم انسان

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

کے داخلی جذبات و احساسات کو منفرد اور نئے اسالیب میں پیش کرکے اسے روحانی سکون اور قلبی طمانیت فراہم کرنے کا ذریعہ بنتی رہی ہیں۔

انسان ہمیشہ سے ہی داخلی اضطراب اور فکری بے چینی کے حل کے لیے فنون لطیفہ کا سہارا لیتا آیا ہے۔ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کی ادبی تاریخوں کے مطالعے سے یہ حقیقت سا منے آ تی ہے کہ ہر دور میں ادب کی تخلیق کا سب سے بنیادی محرک انسانی تجسس رہا ہے۔ کائنات اور اس کے اسرار کو سمجھنے کی خواہش ہی وہ عنصر ہے جس نے انسان کو فکری بلندیوں تک پہنچایا۔

جیسے جیسے زندگی کے مظاہر اور فطرت کے سربستہ رازوں کو جاننے کی کوششیں تیز ہوئیں، علم و فن کی نئی جہات بھی سامنے آتی گئیں۔ کائنات کی تفہیم کا یہ جذبہ ہی درحقیقت تسخیرِ کائنات کے شوق کو بڑھانے کا سبب بنا۔ کبھی ذرات کی معرفت سے حیات کے اسرار کھولنے کی کوشش کی گئی، تو کبھی خارجی دنیا کے مشاہدے کے ذریعے حیات کے رموز تک رسائی حاصل کرنے کی جستجو ہوئی۔ ان تمام علمی اور فکری کاوشوں کے باوجود انسانی تجسس کی شدت میں کبھی کمی نہیں آئی، بلکہ ہر دور میں اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

ادب کی مختلف اصناف میں قصہ گوئی یا کہانی نویسی ہی ایک ایسی صنف ہے جو انسانی تجسس کی تسکین کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ کہانی ہمیشہ سے ہی انسان کے فکری اور جذباتی تجسس کو تسکین پہنچانے کا ایک منفرد وسیلہ رہی ہے، جو نہ صرف زندگی کے تجربات کو سمو کر پیش کرتی ہے بلکہ اسرارِ حیات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتی ہے۔

افسانے اور قصے چاہے براہ راست حقیقتوں سے جڑے ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ حقیقتوں سے بالکل کٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان میں انسانی زندگی کی سرگرمیاں کسی نہ کسی صورت منعکس ہوتی ہیں۔ زندگی کے واقعات اور تبدیلیاں کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ طور پر ان میں جھلکتی ہیں۔

یہ کہانیاں درحقیقت حوصلے اور عزائم کی روشنی سے معمور ہوتی ہیں۔ سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ، امیدیں اور خدشات ان میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خوشیوں، محرومیوں، اخلاقی بلندیوں اور گراوٹوں کی مؤثر ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں بے مقصد تخیل کی بجائے حقیقت پسندانہ تجزیے کا عنصر غالب ہوتا ہے، اور قصہ گوئی کا انداز انہیں دلکش اور پرکشش بنا دیتا ہے۔

یہی خصوصیت ان کہانیوں کو ایک مخصوص دور سے آگے لے جا کر مختلف زمانوں تک پہنچا دیتی ہے، کیونکہ ہر دور کا انسان انہیں اپنے زمانے کی تصویر محسوس کرتا ہے۔ حیرت، تجسس اور تفریح کا اصل ذریعہ یہی کہانیاں

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ہیں، جو قاری کی دلچسپی کو مسلسل قائم رکھتی ہیں۔ انسانی خواب، آرزوئیں، امیدیں اور خدشات سب زندگی کی حقیقتوں سے جڑے ہوتے ہیں، اور قصے ان جذبات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ مطا لعہ کرنے والا کبھی بو ریت کا شکار نہیں ہوتا ، بلکہ تجسس کی تسکین اور مسرت کے لمحات حاصل کرتا ہے۔

۱۸۵۷کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد قصہ نگاری کے داستانوی شعور نے ایک نئی اور زندگی بخش جہت اختیار کی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ کی ناکامی کے بعد برصغیر کی معیشت اور سیاست پر انگریزوں کا تسلط مزید مضبوط ہو گیا، لیکن ہندوستانی معاشرے پر اس کا ایک اہم اثر یہ بھی ہوا کہ لوگ غفلت کی نیند سے بیدار ہونے لگے اور جمود اور تعطل کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔

بے عملی، بے حسی، فرسودہ خیالات، توہم پرستی اور دیگر سماجی برائیوں سے دوری اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ لوگوں کی نظر اس نقطے پر جا نے لگی کہ اگر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے اسی طرح نظریں چرائی جاتی رہیں اور غفلت شعاری برقرار رہی تو مستقبل میں بھی مایوسی اور محرومی کا اندھیرا چھایا رہے گا۔ انگریزوں کے تسلط اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان کے بڑھتے ہوئے اثرات نے ہندوستانی عوام کے لیے سبق آموز اور عبرت انگیز صورتِ حال پیدا کر دی۔

چنانچہ ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی بنیاد پر استوار کرنے کے لیے باشعور طبقہ سرگرم عمل ہو گیا۔ خصوصاً مسلم معاشرے کو وہم و گمان اور بے بنیاد مفروضوں سے نکالنے کے لیے سر سید احمد خان کی تحریک نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم کے خلاف جو نفرت اور مخالفت کا ماحول تھا، اس کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر ثریا حسین لکھتی ہیں کہ:

> ’’اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے مدارس و مکاتب ہندوشان میں موجود تھے لیکن جدید انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے مسلمانوں کی کلی بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کے حصول کو دین کے لیے خطرہ مسلسل تصور کرتے تھے۔ علماء اور قائدین ملت نے بھی انگریزی تعلیم کو ان کے لیے مضرت رساں قرار دیا۔ جس کا ثبوت وہ عرضداشت ہے جو ۱۸۵۳ میں آٹھ ہزار علماء کے دستخط کے ساتھ حکومت کو پیش کی گئی جبس میں کہا گیا کہ ہم مسلمان انگریزی تعلیم کے خواہاں نہیں ۔اس کے برخلاف سرسید احمد

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

خان چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کی
قدر اور اس کوباقی رکھنا چاہیے مگر مغرب
سے بھی بلاتامل فائدہ حاصل کرنے کی کوشش
اور انگریزی زبان سیکھنی چاہیے۔''(۱)

ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نور الحسن نے ۱۸۵۷کی جنگ کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے :

''ہند و ستان میں غد ر 1857 بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔ اس نے سیاسی انقلا ب ہی نہیں پیدا
کیا بلکہ اُس کی وجہ سے سما جی اورا خلا قی
قدروں کے معیار میں بھی زلزلہ آ گیا ۔ادب کیو
ں کر نہ متاثر ہوتا ۔ ادب کی بنیا دیں ہمارے
طریق معا شرت یعنی تہذ یب ہی میں استوا ر
ہو تی ہیں۔''(۲)

ہندوستان کے مسلم معاشرے میں سر سید احمد خان اور ان کے ہم خیال ساتھیوں نے اصلاحی نظریات اور تصورات کو اس قدر خلوص اور محنت سے پیش کیا کہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں ایک مضبوط، مؤثر اور ہمہ جہت تحریک کی شکل اختیار کر گئیں، جس نے معاشرتی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ سر سید کے ہم عصر مفکرین میں ڈپٹی نذیر احمد کو نمایاں مقام حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے قصہ نگاری کے انداز و اسلوب کو پہلی مرتبہ معاشرتی زندگی کی حقیقتوں کے قریب تر کر دیا۔

انہوں نے گھریلو اور سماجی زندگی کی اصلاح کے پیش نظر کئی ناول اور قصے تحریر کیے، جو نہ صرف سماجی اور گھریلو مسائل کے حل کا ذریعہ بنے بلکہ سر سید کی اصلاحی تحریک کے نظریاتی ستونوں کو مزید مضبوطی بھی فراہم کی۔ نذیر احمد کے قصوں میں خیالی دنیا کی بجائے حقیقی زندگی کے محلے اور گلیاں نمایاں ہوئیں۔ توہمات کے بجائے حقیقت پسندی کو فوقیت دی گئی اور مفروضوں کی جگہ انسانی تجربات نے لے لی۔

سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور انسانی رویوں کی عکاسی کا یہ تجربہ نیا اور منفرد تھا۔ بلاشبہ، مقصدیت کی شدت نے نذیر احمد کے قصوں کو کہیں کہیں ناصحانہ اور خطیبانہ انداز دے دیا، لیکن اس کے باوجوداس حقیقت کو نظر اندازکرنا ممکن نہیں کہ اردو فکشن میں رومانویت کی جگہ حقیقت نگاری کی یہ پیشکش ایک نیا اور قابلِ قدر تجربہ تھا۔

پروفیسر وقار عظیم نے اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ:

''نذیراحمد اردو نے پہلے قصہ نویس ہیں
جنہوں نے ایک خاص معاشرے کی سیاسی،
معاشرتی ، معاشی اور اخلاقی زندگی کا غور

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

> سے مطالعہ کرکے اس زندگی کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی پیدا کرکے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس اہم کام کے لیے قصہ(یا کہانی) کا استعمال کیا۔‘‘(۳)

اس سے پہلے قصوں میں انسانی زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی پہلوؤں اور ان سے جڑے مسائل کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ فکری اور معنی خیز قصہ نگاری کا یہی ابتدائی مرحلہ تھا۔

نذیر احمد کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ۱۸۶۹میں تخلیق کیا گیا۔ اس کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد انہوں نے مزید کئی داستانیں تحریر کیں، جن میں ’’بنات النعش‘‘، ’’توبۃ النصوح‘‘، ’’فسانۂ مبتلاء‘‘، ’’ابن الوقت‘‘، ’’ایامی‘‘ اور ’’رویائے صادقہ‘‘ مختلف ادوار میں شائع ہوئیں اور عوام میں مقبولیت حاصل کی۔

متذکرہ بالا ناولوں میں نذیر احمد نے انیسویں صدی کے دوسرے حصے میں پائے جانے والے معاشرتی حالات کو پیش کیا۔خاص طور پر انھوں نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی زندگی انکے مسائل اور حالات کو موضوع بنایا۔ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم ، سادگی، کفایت شعاری ، زندگی میں نظم و ضبط اور تعلیم و تجارت جیسے موضوعات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

کہانیوں کے ذریعے زندگی کے معاملات اور مسائل کو اجاگر کرنے کے اس رجحان کو ابتدائی دور میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا نے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔کہانیوں میں ’’سیر کہسار‘‘، ’’ جام سرشار ‘‘اور ’’فسانہ آزاد ‘‘نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ’’فسانہ آزاد ‘‘کو حقیقت نگاری کی بنا پر خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطابق،اُردو میں افسا نے کا آغاز سرشارسے ہوتا ہے۔ جنہوں نے خود کو ناول نگار قرار دیا۔ درحقیقت، وہ پہلے قصہ گو تھے جنہوں نے اپنی تصنیف ’’فسانہ آزاد ‘‘کو ناول کا درجہ دیا۔ ’’فسانہ آزاد ‘‘کی چوتھی جلد کے دیباچے میں وہ خود اس بات کا ذکر کرتے ہیں:۔

> ’’ مرزا رجب علی بیگ سرور،یادگار زمانہ اور سخنور رنگین ترانہ،استاد مسلم الثبوت تھے گو اس خدائے سخن کا نام سن کر اچھے اچھے زبان دان متعصبوں کا ذکر نہیں اپنے کان پکڑ تے ہیں۔ مگر تحفہء محقر’’ فسانہ آزاد‘‘ انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر لکھا گیا ہے۔جس میں کوئی امر حسب لیاقت یا حسب عقل محال نہیں۔ اردو افسانوں سے اس کا رنگ نہیں ملتا۔‘‘(۴)

Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کی دنیا کے تجربات کو کہانی کے انداز میں پیش کرنے کی کوئی مستحکم روایت ان کے پیش نظر نہیں تھی۔ انہیں یہ احساس تھا کہ فسانہ آزاد پہلا ایسا قصہ ہے جو انگریزی ناولوں کے طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔

سرشار نے اپنے دور کی لکھنوی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے فنی شعور میں جوعمیق ،کشادگی اور جا معیت د کھا ئی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ ان کا وسیع مطالعہ اور متنوع تجرباتی بصیرت تھی۔ مشرقی اور مغربی ادب کی کہانیوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ان کے پیش نظر تھا، اور فسانہ آزاد کی تخلیق میں انہوں نے اسی سرمایۂ ادب سے رہنمائی حاصل کی۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:۔

> ’’سرشار کی اس وسیع النظری ہی کا یہی نتیجہ ہے کہ وہ اردو کے سب سے پہلے باقاعدہ ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔مولانا نذیر احمد نے اپنے قصص سے غیر انسانی ذرائع ضرور نکال دیےتھے مگران کا مطمع نظر اخلاقی تعلیم و تربیت تھی۔ ‘‘(۵)

سرشار کی تخلیقی صلاحیت اور گہری مشاہداتی بصیرت نے لکھنو کی زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرت کو نہایت مہارت سے پیش کیا ہے۔ ان کے عہد کی لکھنوی زندگی کی چلتی پھرتی، گویا بولتی ہوئی تصویر فسانہ آزاد میں نظر آتی ہے۔ یہ دراصل ایک ایسا منظر نا مہ ہےجس میں لکھنو کی انسانی حیات کے تمام پہلو جھلکتے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی روایات، عقائد اور توہمات، اور بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی سبھی اس میں موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔

> ’’فسانہ ازاد‘‘ ان (سرشار کا)سب سے کامیاب اور نمائندہ افسانہ ہے اس کا موضوع لکھنو میں جاگیردرانہ تمدن کی زوال پذیر معاشرت اور اس کے انحطاطی مشاغل کی ہماہمی ہے۔ اس محدود زندگی کی مصوری میں سرشار نے جو وسعت پیدا کی ہے وہ ان کے مشاہدے کی گہرائی اور تخلیقی قوت کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کے وسائل پر قدرت کا بھی ثبوت ہے ۔ لیکن اس منظر کشی اور مصوری میں جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے کوئی خاص نظم و ضبط نہیں' کوئی ایسا رشتہ ء اتحاد اور داخلی یا خارجی ربط نہیں جو قصہ کی حیثیت سے دلچسپ اور بامعنی بناتا ہے۔‘‘(۶)

اُ ردو فکشن میں حقیقت نگا ری کے رجحان پر گفتگو کر تے ہوئے علی

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

عباس حسینی سر شار کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’ سر شار حقیقت نگار تھے اُ نہوں نے معیار
ی چیزیوں کو چھو ڑ دیا اور جو کچھ اپنے گر
د و پیش روزانہ دیکھتے تھے اُس کی مر قع
کشی کی ۔ سر شار کی تصنیفا ت اسی نظر
سے دیکھی جا نے کی مستحق ہیں۔‘‘ (7)

’’فسانہ آزاد ‘‘کے واقعات میں تسلسل اور منطقی ربط کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس میں یہ خصوصیت شامل ہوتی اور کرداروں کی فطری نشوونما پر توجہ دی جاتی تو یہ ایک لازوال تخلیق ثابت ہو سکتا تھا۔ چونکہ یہ ناول ’’اودھ اخبار‘‘ کے لیے قسط وار لکھا گیا تھا اور اس میں معاشرتی حالات کی عکاسی کے ساتھ عوامی دلچسپیوں کو پیش نظررکھا گیا تھا، اسی وجہ سے اس کے واقعات میں فطری ترتیب اور مربوط تنظیم کا پہلو پوری طرح اجاگر نہ ہو سکا۔

اختر انصاری کے مطا بق سرشار کردار نگاری میں مہارت رکھتے ہیں :-

’’فسانہ ازاد ‘‘کے اہم ترین اور نمایاں ترین اوصاف میں اگلی چیز کردار نگاری ہے سرشار کو اس فن میں بڑی دست گاہ حاصل تھی- انہوں نے سینکڑوں مختلف اور متنوع کردار اپنے ناول میں خلق کیے ہیں اور ہر کردار کو ایک زندہ اور جیتے جاگتے انسان کا روپ عطا کر کے اپنے ساحرانہ الفاظ کے پیکر میں غیر فانی بنا دیا ہے۔ فسانہ آزاد میں ہم انسانوں کے ایک گھنے جنگل اور انسانی فطرتوں کے ایک بے کراں سمندر سے دو چار ہوتے ہیں اور کردار نگاری اتنی مکمل اور کامیاب ہے کہ ہر شخص اپنے مخصوص اوصاف کی بنا پر صاف اور دوسروں سے الگ پہچانا جاتا ہے۔‘‘(8)

سرشار نے حقیقت کی دنیا کے مشاہدات، تجربات اور مسائل کو قصبے کے پس منظر میں نہایت تفصیل اور توجہ کے ساتھ پیش کش کی ہے ۔ان کی تخلیقات میں انگریزی ادب کے اثرات صا ف طور پر دکھائی دیتے ہیں، جو افسانے اور زندگی کے باہمی تعلق کو اجاگر کرنے کی روایت کا حصہ بنے اور اس کا تسلسل آگے بھی برقرار رہا۔ اس سلسلے میں ایک اہم کڑی عبدالعلیم شرر کے ناول ہیں، لیکن ان کے یہاں سماجی اور عصری زندگی کا شعور بہت کم نظر آتا ہے۔ سرشار کے بعد مرزا ہادی رسوا نے افسانے کو زندگی کے ساتھ ہم

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

آہنگ کرنے کے عمل کو مزید آگے بڑھایا۔ سرشار کے مشہور ناول" فردوس بریں" پر اپنے تنقیدی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:۔

> ’’یہ سوال بڑا اہم ہے کہ ’’ فردوس بریں‘‘ کیوں شرر کے تمام ناولوں سے زیادہ پراثر ہے ۔ عام طور پر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ اثر اس ناول کی کردار نگاری کی وجہ سے ہے۔ یہ رائے اس ناول کو غلط زاویہ ء نگاہ سے دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ’’ فردوس بریں‘‘ میں سرشار کے تمام رجحانات کچھ اس طرح پر متحد ہو کر ایک مکمل شاعرانہ اثر ایک دلکش عالم پیدا کر گئے ہیں کہ وہ رومانی ناول کی نہایت کامیاب اور پر اثر مثال ہو گئی ہے اور اس عالم میں اس کے بیانات اور کردار نہایت پر لطیف طریقہ پر ابھر کر موزوں معلوم ہونے لگے۔‘‘(9)

اس میں بھی عصری زندگی کے مسائل کا ادراک نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ فسانہ آزاد کے بعد افسانے اور زندگی کے گہرے تعلق کا بھرپور اظہار صرف ’’امراؤ جان ادا ‘‘میں ہی ممکن ہوا۔ " امراؤ جان ادا "میں حقیقت پسندی اختیار کر نے کی کامیاب سعی کی، جو ۱۸۹۹میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ، مرزا رسوا کے قصو ں میں سے یہ تخلیقات ہیں ،جن میں افشائے راز، اختری بیگم، ذات شریف،شریف زادی اور امراؤ جان ادا نمایاں ہیں۔ تاہم، فنی لحاظ سے سب سے زیادہ قدر و قیمت اور شہرت امراؤ جان ادا کو حاصل ہوئی، جس کا بنیادی موضوع، ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مطابق، اودھ کے چند مخصوص شہروں کا زوال ہے۔زندگی اور ناول کے فن کے باہمی تعلق کو جس فنی قا بلیت اور خوبصورتی کے ساتھ ’’امراؤ جان ادا ‘‘میں دیکھایا کیا گیا ہے، اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ:۔

> ’’مرزا رسوا کے وہ معاشرتی ناول جن میں انہوں نے عصری زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اصلاح معاشرت اور اصلاح نفس کے اخلاقی اور غائیتی رنگ اور رجحان کے آئینہ دار ہیں ۔ لیکن اس مصلح اور عالم دین کی شخصیت میں جو حسن پرست فنکار' رند مشرب عاشق اور جدید و قدیم فلسفے اور سائنسی علوم سے بہرہ ور انسان دوست دانشور بیٹھا تھا ۔اس نے بعض نجی محرکات کے زیر اثر ’’ امراؤ جان ادا ‘‘ کے توسط سے اپنے ماضی اور اس کے

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

تہذیبی عروج و زوال کے سرچشموں کو دریافت کیا اور اس طرح اردو کو ایک ایسا ناول دیا جو اس دور کے ناولوں میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتا ہے۔‘‘(10)

انیسویں صدی عیسوی میں ناول کی شکل میں قصہ نگاری یا افسانہ نگاری کی سب سے مکمل تخلیق” امراؤ جان ادا "ہی ہے، جسے ایک شاہکار تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف معاشرتی زندگی کی گہری بصیرت پائی جاتی ہے بلکہ فنی تقاضوں کو بھی نہایت احتیاط اور مہارت کے ساتھ برتنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

’’امراؤ جان ادا‘‘ لکھنوی تہذیب اور اس کے زوال پذیر حالات کا نہایت مؤثر عکاس ہے۔ اس ناول میں نسائی کردار امراؤ جان کے ذریعے ایک مخصوص دور کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ واقعات کی ترتیب، جزئیات کی سلیقہ مندی اور مناسب توازن ناول نگار کی فنی مہارت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی، کہانی میں رونما ہونے والے واقعات کی فطری روانی اور تنوع، مرزا رسوا کے فنی شعور اور گہرے مشاہدے کی غمازی کرتے ہیں۔

اس ناول کی ایک نمایاں خصوصیت اس کے کرداروں کی حقیقی اور جاندار تشکیل ہے۔ مرزا رسوا نے کردار نگاری میں ایک نیا اسلوب متعارف کروایا، جو اس سے پہلے اردو ناول میں کم دیکھنے کو ملتا تھا۔ ” امراؤ جان ادا "کے کردار محض ناول نگار کی تخلیقی سوچ کے محتاج نہیں بلکہ ان میں زندگی کے حقیقی رنگ اور انسانی جذبات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے رویے، خیالات، اور عادات و اطوار میں حقیقت کا گہرا عکس موجود ہے، جس کی بدولت یہ کردار قاری کے ذہن میں گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

مرزا رسوا کی نفسیاتی بصیرت نے ان کرداروں کو محض خیالی پیکر نہیں رہنے دیا بلکہ انہیں فطری انداز میں پروان چڑھایا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے کرداروں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں بلکہ ان کے احساسات و جذبات میں بھی پوری طرح شریک نظر آتے ہیں۔ ” امراؤ جان "ایک مکمل اور متاثر کن کردار کے طور پر سامنے آتی ہے، جبکہ دیگر معاون کردار جیسے راشد علی، نواب سلطان، نواب جعفر علی خان، سیتامل جوہری، امیرن، رام دئی اور خانم بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان تمام کرداروں نے مل کر کہانی کے ماحول کو حقیقت سے قریب تر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ” امراؤ جان ادا "محض ایک تخلیقی داستان نہیں بلکہ ایک حقیقت پسندانہ عہد نامہ بھی ہے، جو اس مخصوص دور کی تہذیبی اور سماجی تصویر کو نہایت خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اردو ادب میں ناول کے فن کو مدنظر رکھتے

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ہوئے " امراؤ جان ادا "کو ایک بے مثال شاہکار قرار دیا ہے:-

"رسوا کو فطرت نے جتنی صلاحتیں دی تھیں وہ سب اس ناول کے پلاٹ میں ایک مرکز پر آکر کارفرما نظر آتی ہیں۔ اردو ادیبوں میں ان ہی کا ذہین' جدید ذہن کی مثال کہا جاسکتا ہے ان ذہن ابتداء میں محض جزئیات کی طرف تھا مگر اس کے دماغ کی ترقی اس امر میں ہے کہ کتنے بڑے اور مکمل تاثرات کو یک جا اور مربوط کرکے ایک کل کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ رسوا کا ذہن اس درجہ پر پہنچ چکا ہے اور اس معنی میں وہ اردو کے تمام ادیبوں سے آگے ہے۔" (11)

ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی مغربی ادبیات کی عطا ہے، جو ابتدا ہی سے زندگی اور اس کے مسائل سے جڑا رہا ہے۔ اس صنف کی سب سے نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی رہی ہے۔ اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی بنیاد رکھنے والوں میں پہلا نمایاں نام پریم چند کا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے قصہ نگاری کے انداز کو نہ صرف بدلا بلکہ سماجی زندگی کو کہانی کے پیرائے میں پیش کرنے کا رجحان بھی متعارف کرایا۔ ابتدائی دنوں میں انہوں نے "دھن پت رائے"کے نام پر رقم کیا ، بعد ازاں "پریم چند" کے قلمی نام سے شہرت پائی۔ ان کی پہلی کہانی "بڑے گھر کی بیٹی" دسمبر ۱۹۱۰ء میں کانپور سے شائع ہونے والے رسالے "زمانہ" میں منظرِ عام پر آئی۔مدن گوپال کے حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس نے اس افسانے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے بیان کیا ہے:-

"مدن گوپال نے اپنی تصنیف " قلم کا مزدور"میں لکھا ہے کہ نواب رائے نام ترک کرکے پریم چند کے فرضی نام سے جو پہلی کہانی" بڑے گھر کی بیٹی" دسمبر ۱۹۱۰ء میں انہوں نے"زمانہ" میں لکھی وہ ان کے فن کانیا موڑ اور حقیقت پسندی کے رجحان کا نقش اول ہے اور اس میں شک نہیں کی کہ یہ کہانی"مختصر افسانہ" کے جدید مغربی تصورات اور معیار کی آئینہ دار ہے۔" (12)

"بڑے گھر کی بیٹی" کو اردو کا وہ پہلا افسانہ قرار دیا جاتا ہے جس میں مغربی افسانوی اندازبھر پور شان کے کے ساتھ جھلکتا ہے۔ اس کہانی کی اشاعت سے پیشتر پریم چند کا افسانوی مجموعہ "سوز وطن" منظر عام پر آ چکا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے "زمانہ"میں اس مجموعے کی اشاعت کا سال ۱۹۰۸ء تحریر کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل پانچ افسانے شامل تھے: "دنیا کا سب سے

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

انمول رتن‘‘، ’’شیخ مخمور‘‘، ’’یہی میرا وطن ہے‘‘، ’’جلسہ ماتم‘‘، ’’حب وطن ‘‘اور ’’عشق دنیا‘‘۔ یہ کتاب دھنپت رائے کے قلمی نام سے شائع ہوئی۔ تاہم اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد برطانوی حکومت نے اس کتاب کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی۔ اگرچہ پریم چند سزا سے محفوظ رہے، مگر حکومت نے کتاب کی تمام نقلیں ضبط کر کے اسے ممنوعہ قرار دیا۔

پیارے لال شاکر نے اپنے مضمون ’منشی پریم چند کی یاد میں‘ ’’پریم چند ‘‘نمبر میں تحریر کرتے ہیں:

> ’’سوزِوطن ایک مختصر کتاب تھی جس میں پانچ چھ افسانے مختصر افسانے تھے اور قیمت بھی چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔لیکن یہی وہ کتاب تھی جس میں انھیں ’’پریم چند‘‘بنا دیا تھا۔ یہ افسانے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ملکی و قومی جذبات کے ترجمان تھے اور عام طور پر ان کو بہت پسند کیا گیا تھا۔منشی صاحب کا تعلق محکمہ تعلم سے تھا۔ ’’سوزِ وطن ‘‘پر نہ صرف اعتراض ہوا بلکہ ملازمت تک کے لالے پڑگئے۔ خدا خدا کر کے وہ بلا ٹل گئی۔ ‘‘ (13)

۱۹۱۵ء میں پریم چند کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’’پریم پچیسی‘‘ کے عنوان سے اہلِ ذوق کی نذر ہوا۔ وقت کے ساتھ اس کی مقبولیت کا سلسلہ دراز ہوا اور ۱۹۱۸ء میں اسی سلسلے کا دوسرا حصہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچا۔ ۱۹۲۰ء میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ’’پریم بتیسی‘‘ کے نام سے منظر عام پر آیا، جس نے پریم چند کی افسانہ نگاری میں پختگی اور فکری وسعت کی نئی جہتیں روشن کیں۔ اس کے بعد ’’خاک پروانہ‘‘، ’’خواب و خیال‘‘، ’’فردوس بریں‘‘، ’’واردات‘‘، ’’پریم چالیسی‘‘،’’ آخری تحفہ‘‘، ’’زاد راہ‘‘، ’’دودھ کی قیمت‘‘ جیسے بیش بہا افسانوی مجموعے مختلف اوقات میں قارئینِ ادب کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتے رہے، اور اردو افسانے کے افق پر اپنی انفرادی چمک بکھیرتے رہے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری میں ہندوستان کی عوامی زندگی اور معاشرتی مسائل کی جو حقیقت پسندانہ تصویر کشی ملتی ہے، وہ اردو افسانے کی روایت میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ ان کے افسانے مقصدیت کے اعتبار سے نہایت صالح اور شفاف نظر آتے ہیں، جن میں اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ اور انسانی قدروں کی پاسداری نمایاں ہے۔ پریم چند کی انسان دوستی، عوام سے محبت اور حق گوئی نے ان کی تحریروں کو ایک ایسی مؤثر اور حیات آفریں توانائی عطا کی ہے، جو انہیں اردو ادب میں ہمیشگی عطا کرتی ہے۔

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

پریم چند کی نثر ی تحریروں میں دیہی زندگی کے کسانوں، مزدوروں اور محنت کش طبقے کے مسائل کو نہایت درد مندی اور شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے معاشرتی ڈھانچے میں موجود طبقاتی فرق اور اس سے جنم لینے والی ناانصافیوں کو بڑی شدت اور سچائی کے ساتھ محسوس کر کے بیان کیا ہے۔ انگریز سامراج، جاگیرداروں، زمینداروں اور ساہوکاروں کے استحصالی رویّے اور عوام دشمن طرزِ فکر کے خلاف انہوں نے جرات مندانہ انداز میں قلم اٹھایا، جو ان کی عوام دوستی اور انسانی ہمدردی کا روشن ثبوت ہے۔

پریم چند کا کمال صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اردو افسانے کو ایک مکمل اور دل آویز تصور عطا کیا، بلکہ انہوں نے مسلسل طویل مدت تک افسانہ نگاری کے ذریعے اس صنف کے تدریجی سفر کو نئی جہات اور استحکام بھی بخشا۔ اس حوالے سے پروفیسر وقار عظیم کا یہ کہنا بجا ہے کہ...

> ’’پریم چند بلاشبہ اردو کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ سب سے پہلے اس لئے کہ ہمارے ذہن میں مختصر افسانہ یا کہانی کا جو تصور ہے وہ سب سے پہلے ہمیں پریم چند نے دیا ہے اور سب سے بڑے اس لیے کہ جن مختلف چیزوں سے کہانی بنتی ہے وہ سب ایک ایک کرکے پریم چند نے ہمیں سکھائی ہیں کہ افسانہ نگاری کی تقریباً ۳۳سال کی عمر میں ہمیں افسانہ ان ساری منزلوں سے گزرتا دکھائی دیتا ہے۔‘‘(14)

پریم چند کا افسانوی اسلوب سادگی، خلوص اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بناوٹی اسلوب، مبالغہ آرائی اور غیر حقیقی فضا سے اجتناب کرتے ہوئے، عام ہندوستانی معاشرے کی سچی تصویریں پیش کیں۔ دیہی زندگی کے مسائل، طبقاتی کشمکش، استحصالی قوتوں کی ظالمانہ روش، اور پسے ہوئے طبقات کی محرومیاں — ان کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔

اردو افسانے کے نقادوں نے اس پر یکساں مو قف اختیار کیا ہے۔ کہ پریم چند کی تحریریں نہ صرف ادبی حسن کا مرقع ہیں، بلکہ ان میں مقصدیت اور حقیقت پسندی کی وہ تابندگی موجود ہے، جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ ان کی زبان میں سادگی کے ساتھ ساتھ فطری شگفتگی اور مقامی رنگ بھی نمایاں ہے، جو ان کے فن کو زمینی حقیقتوں سے جوڑے رکھتا ہے۔ڈاکٹرمحمد حامد لکھتے ہیں:۔

> ’’پریم چند نے زندگی کو ان دریچہ سے دیکھا جہاں سے دیہات کی زندگی ، اس کا

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189

حسن ، اسکے مسائل، اسکی سادگی، اسکا درد و کرب، عوام اور کسانوں کی انفرادی اور سماجی الجھنیں نظر آتی ہیں۔‘‘(15)

پریم چند کے ہم عصر جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی صنف کو اپنایا، ان میں سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے نام نمایاں ہیں ۔ جہاں پریم چند نے حقیقت نگاری اور عوامی مسائل کو اپنا موضوع بنایا، وہیں ان ادیبوں نے رومانویت کی راہ اختیار کی۔ خصوصاً نیاز فتح پوری کو اردو افسانے میں رومانی رجحان کا علمبردار قرار دیا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے زندگی کے جمالیاتی اور حسن پرور پہلوؤں کی تلاش کو مرکزی حیثیت دی۔ پروفیسر محمد حسن افسانوی فکر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ ہماری نثر میں جمالیاتی احساس کی کمی تھی ۔ نیازاور ان سے کچھ پہلے یلدرم اور مہدی افادی نے نثر کی اس فنی صلاحیت کو پہچانا۔ نثر میں بھی مصوری کی جاسکتی ہے اس سے بھی نقاشی اور مرصع کاری ممکن ہے۔‘‘(16)

اردو افسانے کے ابتدائی ارتقائی دور میں دو نمایاں فکری دھارے متوازی طور پر فعال نظر آتے ہیں؛ ایک طرف مقصدیت اور حقیقت نگاری کی روایت تھی، جس کی مکمل اور بھرپور نمائندگی پریم چند نے کی، جبکہ دوسری طرف رومانویت اور جمالیاتی رجحان کی روایت تھی، جسے سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے اپنے افسانوں میں فروغ دیا۔ ان چار ادیبوں نے مل کر اردو مختصر افسانے کے اولین ارتقائی سفر کی بنیاد مضبوط کی۔ سلطان حیدر جوش کے ہاں اصلاحی اور اخلاقی عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ اگر مجموعی طور پر اس عہد جو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک محیط ہے پر نگا ہ ڈالی جا ئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بنیادی طور پر دو ایسی شخصیات سامنے آئیں، جن کے اثرات آنے والے افسانہ نگاروں کی فکری و فنی تشکیل پر نمایاں رہے؛ ایک پریم چند، جو حقیقت پسندی اور سماجی شعور کے نمائندہ ہیں، اور دوسرے نیاز فتح پوری، جو رومانویت اور حسن پرستی کے علمبردار مانے گئے۔

اردو افسانے کی ارتقائی تاریخ کا دوسرا اہم مرحلہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے پر محیط ہے۔ اگرچہ اس دور کے ابتدائی چند برسوں میں پریم چند اور نیاز فتح پوری کی تخلیقات کا سلسلہ جاری رہا، لیکن نئی نسل کے تعلیم یافتہ ادیب ان کے اثرات سے الگ ہو کر تخلیقی تجربات کی نئی راہوں کی تلاش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس عرصے میں قومی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں نے انسانی فکر و شعور کو شدید متاثر کیا۔

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ہندوستانی معاشرے میں ماضی کی اصلاحی تحریکوں کے اثرات رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگے، جبکہ سیاسی اور معاشی میدان میں غیر ملکی حکمرانوں اور مقامی عوام کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش نے ایک اضطراب آمیز فضا قائم کر دی۔ ۱۹۲۹ء کے عالمی معاشی بحران اور روسی انقلاب کی کامیابی کے بعد کمیونزم کے نظریاتی اثرات بھی ہندوستانی فضا میں سرایت کرنے لگے۔ یوں یہ دور فکری، سیاسی اور معاشرتی سطح پر بے یقینی، انتشار اور تغیرات کا حامل ثابت ہوا، جس نے افسانہ نگاروں کو نئے تخلیقی امکانات سے روشناس کیا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے منظم آغاز کے بعد بھی اردو افسانے میں پریم چند کی روایت مختلف صورتوں میں زندہ رہی۔ بعض افسانہ نگاروں نے کہیں ''کفن'' کے سماجی شعور اور کہیں ''انگارے'' کی انقلابی صدا کو اپنائے رکھا۔ پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، اوپندرناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری اور دیگر افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری اور مقصدیت کی وہ راہ اختیار کی، جس کی بنیاد پریم چند رکھ چکے تھے۔

دوسری جانب کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، حسن عسکری، اختر انصاری، مجنوں گورکھپوری اور دیگر ادیبوں نے انقلابی رومانویت کا وہ رویہ اپنایا، جو سب سے پہلے "انگارے" کے افسانوں میں شدت کے ساتھ ابھرا تھا۔ اس دور کے فکری رجحانات اور افسانوی میلان کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

> ''اس دور کے افسا نوں میں حقیقت نگا ر ی کا عمل اپنے عروج پر نظر آ تا ہےاور زندگی کے گھنا ؤ نے پہلو ابھر کر سا منے آگئے ہیں بے شک اصل کو بعینہ پیش کر نے کا یہ رجحان مستحسن ہے اور اسے فن کار کی دیانت اور صا ف گوئی کی ایک قا بل قدر کا وش کا نام دیا جا سکتا ہےتا ہم فن کا تقا ضا یہ ہے کہ'' حقیقت '' سپا ٹ اور بے رنگ ہو کر لطا فت اور رعنا ئی سے محروم نہ ہو جائے لیکن جب حقیقت نگا ری کو ایک مقصد قر ار د ے کر فن کے تقا ضوں سے منھ موڑ لیا جا تا ہے۔ تو یہ عمل بجا ئے خود ایک شعور ی کاوش کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اختر اورینوی اور بعض دوسرے افسا نہ نگاروں کو اسی لیے ایک بڑی مشکل پیش آئی ۔ جب وہ ماحول کی عکاسی میں سپا ٹ پن کی حد تک

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue
Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

حقیقت نگار بن گئے ۔البتہ منٹو نے حقیقت نگا
ری کی رو ش کے با وصف سپا ٹ پن سے
اپنا دا من بچا ئے رکھا اس کی وجہ غالبا یہ
تھی کہ منٹو نے اپنے لیے ایک ایسا میدان
منتخب کیا جو ایک عام قاری کے لیے بے
حد دلچسپ تھا ۔‘‘(۱۷)

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر اردو افسانے میں حقیقت نگاری کے دو نمایاں رجحانات سامنے آئے۔ ایک رجحان وہ تھا جس میں خارجی دنیا کے مشاہدات اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی، جب کہ دوسرا رجحان داخلی دنیا کی پیچیدگیوں اور فرد کے باطن میں پیدا ہونے والی کشمکش سے متعلق تھا۔ اختر انصاری کے افسانے زیادہ تر رومانی مزاج کے تابع ہیں، جہاں حقیقت نگاری میں تخیل اور جذباتی کیفیت غالب رہتی ہے۔ ان کے اسلوب میں تشبیہات اور استعارات کا خوبصورت استعمال افسانوی بیانیے کو شاعرانہ رنگ دے دیتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے افسانے بھی ایک خاص رومانویت اور تاثراتی دلکشی کے حامل ہیں، جو ان کی حساس طبیعت اور جمالیاتی مزاج کا مظہر ہیں۔ ان کے افسانے ”تنہائی "، ”خواب و خیال" اور ”سمن پوش" اس کا بہترین اظہار ہیں۔

دوسری جانب سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور حسن عسکری نے افسانے میں داخلی حقیقت نگاری کو غیر معمولی اہمیت دی۔ انہوں نے فرد کی نفسیاتی الجھنوں، جذباتی تضادات اور جنسی جبلت کی ناکامی سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کا زاویہ سماجی اقدار کے برخلاف فرد کی باطنی دنیا میں جھانکنے کا تھا۔ اختر اورینوی کے ابتدائی افسانوں میں بھی خارجی حقیقت نگاری کا رجحان نمایاں تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید ارتقاء پذیر ہوتا گیا۔

پریم چند نے اردو افسانے میں فرد کی طبعی خواہشات اور سماجی ذمہ داریوں کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ کو اپنی کہانیوں کا اہم موضوع بنایا۔ افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں ان کی یہ کاوش بے حد قابلِ قدر تھی اور اردو ادب میں ایک نئی فکری سمت کا تعین کرتی ہے۔ تاہم، فرد کے اندرونی جذبات، نفسیاتی الجھنوں اور سماجی دباؤ سے جنم لینے والی داخلی کشمکش کو ترقی پسند دور کے افسانہ نگاروں نے زیادہ باریک بینی اور فنکارانہ مہارت سے پیش کیا، جس سے افسانے میں انسانی باطن اور اس کے تضادات کی نہایت عمدہ تصویر کشی ممکن ہو سکی۔

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189

http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

حوالہ جات

1) ثریا حسین،ڈاکٹر ، ’’سرسید احمد خان اور ان کا عہد ، ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱۲
2) احسن فاروقی ، ڈاکٹر ، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر،’’ ناول کیا ہے‘‘؟، نسیم بک ڈپو، لکھنو،طبع دوم ۱۹۶۰ء، ص 142
3) وقار عظیم، پروفیسر ، ’’داستان سے افسانے تک‘‘، اردو اکیڈمی سندھ ،کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۵۹
4) محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر ، ’’اردو ناول کی تنقیدی تاریخ‘‘، ادارہ فاروغ اردو، لکھنو، ۱۹۶۲ء، ص ۶۱
5) علی عباس حسینی،’’ناول کی تاریخ اور تنقید‘‘،نا شر : انڈین بک ڈپو، لکھنو،طبع اول،۱۹۴۴ء، ص ۲۲۰
6) قمر رئیس، ڈاکٹر ، ’’پریم چند کا تنقیدی مطالعہ‘‘، سرسید بک ڈپو،علی گڑھ، ۱۹۶۸ء،ص ۱۵۱
7) علی عباس حسینی ، نا ول کی تاریخ اور تنقید ، انڈین بک ڈپو، لکھنو،طبع اول،۱۹۴۴ء، ص ۲۲۰
8) اختر انصاری(دہلوی)، ’’مطالعہ و تنقید‘‘، ناشر : فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۵ ء، ص ۱۶۲
9) محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر ، ’’اردو ناول کی تنقیدی تاریخ‘‘، ناشر : ادارہ ء فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۲ ء، ص ۱۱۸
10) قمر رئیس، ڈاکٹر ، ’’تلاش و توازن‘‘، ادارہ خرام پبلی کیشنز،دہلی،۱۹۸۶ ء ، ص ۳۲
11) محمد احسن فاروقی،ڈاکٹر، ” اردو ناول کی تنقیدی تاریخ“ ، ادارہ فروغ اردو ،لکھنو ،۱۹۶۲ء ،ص۱۴۴تا۱۴۵
12) قمر رئیس، ڈاکٹر ، ’’تلاش و توازن‘‘، ادارہ خرام پبلی کیشنز،دہلی،۱۹۸۶ ء ، ص ۱۰۷
13) منشی پیارے لال شاکر ،مضمون :”منشی پریم چند کی یاد میں“زمانہ ،پریم چند نمبر ،مرتبہ :منشی دیا نرائن نگم،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی ،۲۰۰۲،ص۶۳
14) وقار عظیم، پروفیسر ، ’’داستان سے افسانے تک‘‘، اردو اکیڈمی سندھ ،کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۶۰
15) محمد حامد ،ڈاکٹر،”اردو افسانے کا ارتقاء‘‘ ،حکومت اترپردیش ،ہندوستان،۱۹۸۶،ص۱۱۹
16) محمد حسن ،ڈاکٹر،”نیاز کا ادبی مرتبہ‘‘نگار ،سالنامہ نیاز نمبر ۱۹۶۳،شمارہ ۵-۶،کراچی ،ص۲۸

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special Issue

Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189

http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

17) وزیر آغا ،ڈاکٹر ،”تنقید واحتساب‘‘،علی گڑھ بک ڈپو ،علی گڑھ، ١٩٤٦،ص 138